ان کے کردار کے ان روشن پہلوؤں پر نگاہ جماتے اور ان کی ان خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے تو اس طرح ہم ان کے غلبہ اور اپنی شکست سے صحیح سبق حاصل کرنے والے بنتے اور اپنے اخلاقی ورثہ کو جو ہم ہی نے ان کی طرف منتقل کیا تھا گویا دوبارہ ان سے واپس لیتے۔ لیکن بدقسمتی سے اس معاملہ میں ہم نے وہی غلط روش اختیار کی جس کی طرف ابن خلدون نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہم میں سے بہتوں نے یہ سمجھا کہ انگریز کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ ٹانگوں میں پتلون ڈال کر چلتا ہے، سر پر ہیٹ لگاتا ہے، شراب پیتا ہے، بال روم میں جا کر ناچتا ہے اور اپنی عورتوں کو نیم عریاں حالت میں مجلس میں پھراتا ہے۔ بس غلط فہمی کا اثر یہ ہوا کہ انگریزوں کی خوبیاں تو ہمارے اندر پیدا نہ ہو سکیں البتہ ہماری قوم کے ایک طبقہ نے ان کی برائیاں بڑے اہتمام سے اور کافی پیسے خرچ کر کے اپنے اندر جمع کر لیں اور اس طرح اپنی اپنی قدیم طرز کی بہت سی برائیوں کے اوپر جدید طرز کی کچھ برائیوں کا بھی اضافہ کر لیا اور جب یہ نئی ولایتی بلا گھر میں داخل ہو گئی تو قدرتی طور پر خود اپنی قدیم تہذیب و روایت کی کچھ اچھی چیزیں جو دستبرد زمانہ سے بچ بچا کر ہمارے گھروں کے گوشوں اور کونوں میں دبی دبائی پڑی ہوئی تھیں وہ بھی رخصت ہو گئیں۔

آزادی کے حصول کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ یہ مرعوبیت کچھ کم ہوتی لیکن افسوس ہے کہ یہ چیز نہ صرف یہ کہ کم نہیں ہوئی، بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا یہ چیز بڑھی ہے اور برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا اثر ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں ہو رہا ہے۔ خاص کر ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس مرعوبیت کا بری طرح شکار ہو رہا ہے جو ہماری قومی و ملی آرزوؤں کا اصلی مرکز و محور خیال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر امریکہ یا روس کو بطور ایک نمونہ اور مثال کے اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اس عقیدت کے ساتھ سامنے رکھتے ہیں کہ خود ان کا اپنا ماضی ان کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ اس عقیدت کے غلو نے ان لوگوں کو برائی اور بھلائی میں امتیاز سے بھی بالکل محروم کر دیا ہے۔ یہ آنکھ بند کر کے ان سب چیزوں کو اختیار کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں جو ان قوموں کے اندر ان کو چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ چیزیں مضر ہیں یا مفید۔

اس حقیقت کا ایک واضح ثبوت ہماری قوم کے ان طلبہ اور طالبات کے کردار سے بھی ملتا ہے جو امریکہ یا انگلستان تعلیم کے لیے جاتے یا بھیجے جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان ملکوں میں تعلیم کے لیے جانے اور بھیجنے کا اگر کوئی فائدہ ہے تو یہی ہے کہ ان ملکوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں جو حیرت انگیز ترقیاں کی ہیں، ان کی تعلیم ہماری قوم کے نوجوان بھی حاصل کریں اور ان چیزوں کو سیکھ کر جب وہ واپس آئیں تو پوری محنت اور جانفشانی کے ساتھ ان کو اپنے ملک میں بھی رائج کریں تاکہ ان کا پس ماندہ ملک بھی ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو سکے۔ لیکن ان نوجوانوں کے تعلیمی و تحقیقی مشاغل سے متعلق جو تفصیلات وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں نکلتی رہتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے یہ نوجوان جن پر ہماری مستقبل کی بہت سی امیدوں کا انحصار ہے اپنی اس نفسیاتی بیماری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اس ماحول میں پہنچ کر اس بری طرح تباہ ہوتے ہیں کہ اس قسم کی تباہی کسی بدقسمت قوم ہی کے حصہ میں آسکتی ہے۔ حال ہی میں کراچی کے ایک معاصر نے اپنے صفحات میں ان طلبہ اور طالبات کے مشاغل کی تفصیلات شائع کی ہیں جو اس وقت برطانیہ کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ یہ تفصیلات بیشتر لکھنے والے کے ذاتی مشاہدات پر مبنی معلوم ہوتی ہیں اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اس وجہ سے کم از کم ہمارے نزدیک ان کے جھٹلانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ اور اگر ہم اس میں شدت تاثر یا مبالغہ کا بھی کچھ حصہ تسلیم کر لیں جب بھی اس کا جتنا حصہ بچ رہتا ہے وہ اس تعلیم کے نتائج کی طرف سے مایوس کرنے کے لیے بالکل کافی ہے جس کو ہم اعلیٰ تعلیم کہتے ہیں اور جس سے ہم اپنے مستقبل کی تمام ترقیوں کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان تفصیلات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ نوجوان انگلستان اور امریکہ جا کر انگریزوں اور امریکیوں سے ان کی خوبیاں اور ان کے علوم تو کیا سیکھیں گے اپنی بچی کھچی خوبیاں بھی وہاں گنوا بیٹھتے ہیں۔ جو مرعوبیت وہ یہاں سے ساتھ لے کر جاتے ہیں وہ وہاں پہنچ کر انھیں وہ ٹھوکریں کھلاتی ہے کہ انھیں کچھ ہوش ہی نہیں رہ جاتا کہ کیا کرنے آئے تھے اور کیا کر چلے ہیں۔

ضرورت تھی کہ ہماری قوم کے اہل فکر اس مرعوبیت کو دور کرنے کی کوشش کرتے تاکہ ہمارے نوجوان ذہنی توازن اور خیر و شر میں امتیاز کے ساتھ ان قوموں کے علم و فلسفہ سے استفادہ کر سکتے لیکن

اس مرعوبیت ہی کا ایک نہایت گھنونا پہلو یہ ہے کہ ہمارے اندر ایسے ایسے مفسر پیدا ہوگئے ہیں جو اپنے زعم کے مطابق قرآن سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن نے جن لوگوں کو آیت انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں) میں علماء کہا ہے اس سے مراد یہی سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر ہیں جو طبعیات، نباتات، حیوانات، طبقات الارض، فضائیات کے اسرار پر غور کرتے ہیں اس لیے کہ خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔

یہی لوگ ہیں جو اولوا الالباب ہیں اس لیے کہ یہ لوگ سمع و بصر اور فواد سے کام لے رہے ہیں اور کائنات میں غور و فکر کرتے ہیں۔

یہی لوگ مومن و متقی ہیں اس لیے کہ قرآن میں مومنین و متقین کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "وہ کائنات سے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد رموز فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔"

پھر یہی لوگ اہل جنت ہیں اس لیے کہ قرآن نے فقر و غربت کی زندگی کو عذاب سے تعبیر کیا ہے اور رزق کی فراوانی قرآن میں جنت کی خاص خصوصیت بیان کی گئی ہے۔

اس قسم کی ذہلی باتیں جو بعض رسالوں میں نکل رہی ہیں یہ سب اسی مرعوب ذہن کی غمازی کر رہی ہیں جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ ہر شخص، خواہ اس کو قرآن کا کچھ علم ہو یا نہ ہو، اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن دنیا کے ملحدین و منکرین کو سند فضیلت بانٹنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ طبعیات، نباتات، طبقات الارض اور فضائیات کے اسرار و قوانین پر غور و فکر اور ان کا انکشاف قرآن کی نگاہوں میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کام ہے لیکن جو سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر اتنے کوڑ مغز اور بے بصیرت ہیں کہ انھیں خدا کی اس کائنات کے اتنے عجائب دیکھنے کے بعد بھی خدا کہیں نظر نہیں آتا قرآن کے نزدیک وہ علماء نہیں بلکہ جہلاء اور حمقاء ہیں۔ اسی طرح سمع و بصر اور فواد سے کام لینا اور ان کو ان کے مقاصد میں استعمال کرنا قرآن کے نزدیک انسانی سعادت کے فتح باب کی کلید ہے لیکن اگر یہ سمع و بصر سب کچھ دیکھیں اور سب کچھ سنیں لیکن اسی کو نہ دیکھ سکیں جو سب سے زیادہ آشکارا اور اسی ندائے غیب کو نہ سن سکیں جو سب سے زیادہ بلند اور رعد آسا ہے تو قرآن کے نزدیک یہ کان بہرے اور یہ آنکھیں اندھی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس کائنات کے اسرار کی جستجو اور رموز فطرت کی عقدہ کشائی کا ذوق ایمان کے دروازے

کی کلید ہے لیکن جس جستجو کا مطلوب خدا نہ ہو اور جو عقدہ کشائی ایمان بالآخرت کی طرف رہبری کرنے والی نہ ہو، قرآن کے نزدیک یہ جستجو ہرزہ گردی اور یہ عقدہ کشائی باد پیمائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح روٹی اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت و رحمت ہے بشرطیکہ یہ جن کو ملے وہ شکر گزاری کے جذبہ، اور اطاعت الٰہی کے مقصد کے ساتھ کھائیں اور کھلائیں لیکن اگر خدا یہ روٹی اور اس کے سارے لوازم ان لوگوں کو دے جو اس کے باغی اور نافرمان ہیں اور وہ اسی جذبہ اور اسی مقصد کے ساتھ اس روٹی کو کھائیں جبھی تو یہ روٹی خدا کی رحمت نہیں ہے بلکہ اس کی طرف سے ایک لعنت ہے جس کے پیچھے اللہ تعالےٰ کا عذاب چھپا ہوا ہوتا ہے۔

یہ باتیں قرآن مجید میں اس قدر واضح ہیں کہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآن کا ایمان و اسلام کے ساتھ ایک مرتبہ بھی مطالعہ کرے اور اس کی ہر سورہ میں اس کے یہ حقائق اس کے سامنے بالکل بے نقاب ہو کر نہ آئیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص قرآن مجید کی طرف اس طرح کے مزخرفات منسوب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتی کہ خدانخواستہ قرآن میں ان چیزوں کے لیے کوئی گنجائش موجود ہے بلکہ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے آغاز مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہمارے اندر بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو روس اور امریکہ وغیرہ سے اس درجہ مرعوب ہیں کہ انھیں ہر چیز اب انہی کی پسند آتی ہے اور یہ بیماری ان کے اندر اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ قرآن بھی اپنے ہر پارے اور اپنی ہر سورہ میں روس اور امریکہ ہی کی تعریف و توصیف کرتا نظر آئے اور اگر ان کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تو وہ کوشش کر کے قرآن کی آیتوں کے اندر وہ معنی پہنا دیتے ہیں جو ان کے اپنے دل میں ہوتے ہیں۔

اس قسم کے خیالات اگر کسی حلقہ میں مقبولیت حاصل کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان خیالات کے لیے قرآن سے بزعم خویش جو دلیلیں فراہم کی جاتی ہیں وہ بڑی مؤثر اور دل نشین ہوتی ہیں۔ آخر اتنا سادہ لوح کون ہو سکتا ہے جو یہ مان لے کہ قرآن فی الواقع انہی ملحدین و بے دین سائنس دانوں کو اولوا الالباب اور علماء کے القاب سے نوازتا ہے۔ یا انہی فساق و فجار کو مومن و متقی قرار دیتا ہے۔ ان

باتوں کو سب ہی لایعنی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ایک چیز کو ان کا دل چاہتا ہے اور ایک دوسرا شخص ان کو یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ یہ جو کچھ تم چاہ رہے ہو ٹھیک یہی قرآن کی تعلیم بھی ہے تو آخر اس کے قبول کر لینے میں کیا خرابی ہے؟ یہ چیز ایک دھوکا اور مغالطہ سہی لیکن جو دھوکا اور مغالطہ اپنی خواہشوں کے مطابق ہے اس میں پڑ جانے میں کیا حرج ہے! بس اسی قسم کے احمقانہ خیالات کے تحت بہت سے لوگ ان مزخرف باتوں کی تائید و تشہیر شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں پر یہ دھونس جما سکیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں حرف بحرف قرآن کے احکام کی تعمیل میں کر رہے ہیں۔

درحقیقت غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کی یہ خواہش بھی ان کی مرعوبیت ہی کا ایک پہلو ہے۔ ایک طرف روس اور امریکہ سے ان کی مرعوبیت انھیں مجبور کرتی ہے کہ یہ انھی کے فکر و عمل کو ہر پہلو سے سراہیں اور آنکھیں بند کر کے کم از کم بے قیدی و آزادی اور لذات نفس کے حد تک ان کی پیروی کریں، دوسری طرف اپنی روایات اور اپنے مذہب سے جو مرعوبیت "وراثۃً" انھیں ملی ہے وہ تقاضا کرتی ہے کہ جو جرم بھی وہ کریں اس کی تائید و حمایت میں کسی نہ کسی طرح مذہب کو بھی کھڑا کر لیں۔ ضمیر اور رائے کی آزادی نہ ان بیچاروں کو روس اور امریکہ کی عقیدت اور نیازمندی کے معاملہ میں حاصل ہے اور نہ قرآن کے ساتھ اظہار وفاداری کے معاملہ میں۔ یہ روس اور امریکہ کے مرید ہیں لیکن صرف ان کی لذت پرستیوں اور بے قیدیوں کے حد تک، ان کی اولوالعزمیوں میں ساتھ دینے کے عزم و حوصلہ کا اب تک انھوں نے کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا ہے۔ اسی طرح یہ قرآن کے ساتھ بھی وفاداری کا دم بھرتے ہیں لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک اس کو کھینچ تان کر اپنی خواہشوں کے مطابق بنا سکیں۔ مخلص اور حری یہ کسی کے معاملہ میں بھی نہیں ہیں۔ نہ اپنے ارضی خداؤں کے معاملہ میں، نہ اپنے آسمانی خدا کے معاملہ میں۔

یہ مرعوبیت، ہمارے نزدیک اس وقت ہماری قوم کی سب سے بڑی بیماری ہے جس کا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس بیماری کے موجود ہوتے ہوئے ہم علم یا عمل کے کسی میدان میں بھی کوئی صحت مندانہ قدم کبھی نہیں اٹھا سکتے۔ اس کا جوڑ ایک غلام قوم کے ساتھ تو ہو سکتا ہے لیکن ایک آزاد قوم کے اندر، جو ایک اولوالعزم قوم کی طرح اپنے نظریات اور اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق زندگی بسر کرنا اور ترقی کرنا چاہتی ہو،

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

سورۃ بقرہ

(۴)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

۹ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تشریح

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا کفر کے معنی اصل لغت میں ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ شکر کے ضد کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور ایمان کے ضد کی حیثیت سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ناشکری اور کفران نعمت کے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں انکار کے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لفظ کی اصل روح ان دونوں معنوں کے اندر موجود ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مطلق بھی استعمال ہوا ہے اور اپنے مفعول کے ساتھ بھی۔ جہاں مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو متعین طور پر اس مفعول ہی کا کفر و انکار مراد ہے۔ لیکن جہاں کسی مفعول کے بغیر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم تو ان تمام چیزوں کے انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے

جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن کہیں کہیں ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جس کا پتہ قرینہ اور موقع و محل سے چلتا ہے۔

موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ الذین کفروا سے یہاں انکار کرنے والوں کا کوئی مخصوص گروہ مراد ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی چند خاص صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہے، یہ کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حال تمام کفار کا نہیں تھا، ان میں بہتیرے ایسے بھی تھے جو ابتدا میں منکر و مخالف رہے لیکن بعد میں اسلام لائے۔ اس وجہ سے یہ امر تو بدیہی ہے کہ یہاں کوئی مخصوص گروہ مراد ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟

ہمارے نزدیک اس سے مراد مشرکین، اہلِ کتاب اور منافقین کے وہ لیڈر اور سردار ہیں جن پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پوری طرح واضح ہو چکی تھی لیکن اس وضاحت کے باوجود وہ محض ضد، ہٹ دھرمی، انانیت اور حسد و تکبر کے سبب سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس تخصیص کے بعض وجوہ یہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سے اوپر والے ٹکڑے میں اس گروہ کا بیان ہوا ہے جو قرآن پر ایمان لانے والا تھا۔ وہاں ہم نے ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس سے اہلِ کتاب اور بنی اسمٰعیل کے وہ تمام سلیم الفطرت اور خدا ترس لوگ مراد ہیں جن کے ضمیر زندہ، جن کی صلاحیتیں محفوظ اور جن کے دل بیدار تھے۔ انہی کے مقابل میں مذکورہ آیات میں اس گروہ کا بیان ہو رہا ہے جو ایمان لانے والا نہیں ہے۔ یہ تقابل خود دلیل ہے کہ اس سے مراد، مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے وہ لوگ ہوں جن کو دنیا پرستی اور حسد و انانیت نے بالکل اندھا بہرا کردیا تھا، جن کی فطرت مسخ ہو چکی تھی اور جو قبولِ حق کی تمام صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہو چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن نے اس گروہ کی جو خصوصیات اس کا نام لیے بغیر بیان کی ہیں بعینہٖ وہی خصوصیات دوسرے مقامات میں یا تو نام کی صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں یا ایسے واضح قرائن کے ساتھ بیان کی ہیں . . . . جن سے گروہ کا تعین آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔ ان مقامات کو

سامنے رکھ کر اگر اس آیت کے اجمال کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو آدمی اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں۔ یعنی اس سے مشرکین، یہود اور منافقین کے وہ سردار اور لیڈر مراد لیے جائیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ قرآن کی دعوت حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْإِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۱۰۶ - ۱۰۸ نحل)

جس نے کفر کیا اللہ کا ایمان کے بعد، بجز ان کے جو مجبور کیے گئے، اور ان کے دل ایمان پر جمے رہے، پر جن کے سینے کفر کے لیے کھل گئے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کافر قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مہر کردی ہے اور یہی لوگ ہیں جو بے خبر ہیں۔

اس آیت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکنے یا حق کے واضح ہو جانے کے بعد محض دنیا پرستی کی وجہ سے کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان پر اللہ کا غضب ہوتا ہے، ان کے لیے عذاب عظیم ہے، ان کے لیے خدا ایمان کی راہ نہیں کھولا کرتا، ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حقیقی مصداق اگر ہو سکتے تھے تو سرداران قریش، علمائے یہود اور منافقین ہی ہو سکتے تھے۔ یا پھر وہ لوگ جو انہی کی روش اختیار کریں۔

دوسری جگہ تمام انبیاء کے مخالفین و معاندین کے بارہ میں فرمایا ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۱۰۱ - اعراف)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتیں ہم تم کو سناتے ہیں۔ ان کے پاس ان کے انبیاء کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے، بوجہ اس کے کہ وہ جھٹلاتے رہے پہلے سے۔ اسی طرح اللہ مہر کردیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

خاص طور پر یہود کے بارہ میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا

(۱۵۵ - نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، نبیوں کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

اسی طرح منافقین کے بارہ میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ

(۳ - منافقون)

یہ اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی سو وہ سمجھتے نہیں۔

قرآن کی ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں الذین کفروا کا اشارہ ایک خاص گروہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ گروہ نہ تو مخصوص طور پر مشرکین کا ہے نہ محدود مفہوم میں اہل کتاب کا بلکہ یہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں گروہوں کے ان افراد پر مشتمل ہے جو حق کو اچھی طرح پہچان چکنے کے بعد اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

سلف سے اس آیت کی تاویل میں جو اقوال منقول ہیں ان سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے اہل کتاب کے وہ ہٹ دھرم لوگ مراد ہیں جو ان تمام پیشین گوئیوں کو جھٹلا چکے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے صحیفوں میں موجود تھیں اور اس طرح انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے آخری نبی سے متعلق لیا تھا۔ ربیع بن انس کے نزدیک اس سے ان مختلف پارٹیوں کے لیڈر مراد ہیں جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔ یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں بس فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ ربیع بن انس کی تاویل نسبتہً جامع اور وسیع ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے اس وجہ سے ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ءَاَنْذَرْتَهُمْ انذار کے معنی ڈرانے، ہوشیار کرنے اور خبردار کرنے کے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام

کی دعوت و تبلیغ ایک طرف تو نہایت ٹھوس انفسی و آفاقی دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس میں انذار و تبشیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ تبشیر کا مفہوم اس فوز و فلاح اور اس کامیابی و کامرانی کی بشارت دینا ہے جو نبی کی دعوت قبول کر لینے اور اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اختیار کر لینے سے دنیا اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتی ہے۔ انذار کا مفہوم ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنا ہے جن سے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام عام حالات میں یہ دونوں ہی فرض انجام دیتے ہیں۔ لیکن جہاں ضدی اور ہٹ دھرم لوگ مقابل میں آن کھڑے ہوتے ہیں جن کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسد اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے، وہاں قدرتی طور پر نبی کی دعوت میں انذار کا پہلو غالب ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت حالات اسی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں آپ کے کام کو صرف انذار ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آیت زیر بحث کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ان مخالفین و معاندین سے ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ جانتے ہوئے کر رہے تھے کہ آپ نبی برحق ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

انذار ہو یا تبشیر دونوں کی حقیقت ان قدرتی نتائج سے آگاہ کرنا ہے جو ایمان یا کفر کے اندر مضمر ہیں جس طرح ایک طبیب اپنے زیر علاج مریض کو دوا اور پرہیز کے فوائد اور بد پرہیزی اور مرض سے غفلت کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح پیغمبر بھی اپنی قوم کو اپنی دعوت کے ماننے اور نہ ماننے کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

بعض لوگ انذار کی اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب سے مذہب کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ موہوم خطرات کے ڈراوے سنا سنا کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسان کی عقل سے اپیل نہیں کرتا۔ یہ معترض عموماً دو باتوں سے بے خبر ہیں، ایک تو یہ کہ یہ بات سے بے خبر ہیں کہ قرآن کی دعوت صرف انذار و تبشیر ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر نہایت مضبوط انفسی و عقلی دلائل بھی رکھتی ہے، انذار و تبشیر اس کی دعوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسری چیز جس سے یہ بے خبر ہیں وہ ایمانی و اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہے۔ یہ لوگ اس بات سے تو واقف ہیں کہ سنکھیا کھا لینے سے آدمی مر جایا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کفر و نفاق

اور جھوٹ سے بھی انسان ہلاک ہوجایا کرتا ہے۔ پیغمبر کو چونکہ اخلاقی اقدار کے ثمرات و نتائج کا اچھی طرح علم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور اسی انداز بیان میں آگاہ کرتا ہے جو انداز بیان اس کے علم و یقین کے شایان شان ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید انذار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

ختم اللہ خَتم کے معنی عربی زبان میں موم یا مٹی یا کسی اسی طرح کی چیز پر ٹھپہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منہ کو اس طرح بند کردینے کے لیے استعمال ہونے لگا جس کے بعد نہ اس میں کوئی چیز داخل ہوسکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔

قرآن مجید میں بعض جگہ جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے تو اس سے مقصود نفس اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس قانون یا اس سنت کو اپنی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے جس قانون اور سنت کے تحت وہ فعل ظہور میں آتا ہے چونکہ یہ قانون خود اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فعل جو اس قانون کے تحت ظہور میں آتا ہے بعض اوقات قانون کے بنانے والے کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے۔ تعبیر مطلب کا یہ اسلوب کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں دلوں پر مہر لگانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن مقصود اس سے اس سنت اللہ کی اپنی طرف نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے جاری کر رکھی ہے اور جس کے تحت دلوں پر مہر کرنے کا یہ فعل واقع ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سنت اللہ کیا ہے تو اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

علیٰ سمعھم ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہاں جمع کا لفظ واحد کیوں استعمال ہوا جب کہ قلوب و ابصار کے الفاظ جمع استعمال ہوئے ہیں۔ کلام کی ہم آہنگی کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بھی جمع یعنی اسماع استعمال ہوتا؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کا تعلق اہل زبان کے طریق استعمال سے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کم و بیش ۲۲ مقامات میں استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ قلوب، افئدہ اور ابصار کے ساتھ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ واحد ہی کی شکل میں استعمال ہوا ہے، کہیں بھی جمع کی شکل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید زبان کے لحاظ سے بھی ایک معیاری چیز ہے اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ فصحائے عرب اس سیاق میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔

۱۰ - ختم قلوب کی حقیقت اور اس کے بارہ میں قانونِ الٰہی

یہاں جس ختم قلوب کا ذکر ہے اس کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ اس ختم سے مراد ختم ظاہری نہیں ہے بلکہ ختم معنوی مراد ہے۔ جہاں تک ظاہری چیزوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا تعلق ہے یہ لوگ ان کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے تھے لیکن اس مشرب کے لوگ اپنی سمجھ بوجھ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اس دنیا کے ظواہر و محسوسات ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ ان ظواہر و محسوسات کے پس پردہ جو حقائق ہیں ان کی طرف نہ تو یہ خود متوجہ ہوتے اور نہ کسی دوسرے توجہ دلانے والے کی بات پر کان ہی دھرتے۔ دنیا اور زخارف دنیا میں ان کا انہماک اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی ان کے اندر گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ اپنی تمام ذہانت و فطانت اسی ایک مقصد پر صرف کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں تو ان کی عقل بڑی تیز ہوجاتی ہے لیکن روحانی اقدار و حقائق کے معاملہ میں وہ بالکل ہی کند ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ان کے مذاق کو بھی اس قدر بگاڑ دیتی ہے کہ صرف وہی باتیں ان کو اچھی لگتی ہیں جن سے ان کے اس بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ جن باتوں سے اس کی حوصلہ شکنی ہو، خواہ وہ کتنی ہی معقول ہوں، ان سے ان کی طبیعت کو وحشت ہوتی ہے۔ اسی صورت حال کو یہاں ختم قلوب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسری یہ کہ اس ختم قلوب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں ہی سے ان کے دلوں پر ٹھپے لگا کر پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو اس قدر بگاڑ لیا ہے کہ ان کے دل پیغمبر کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے ہر انسان کو اچھی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ساتھ ہی نیکی کو پسند کرنے اور بدی سے نفرت کرنے کا مذاق بھی اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ ان فطری صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کے بعد اس نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے کہ چاہے وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے چاہے بدی کا۔ آگے چل کر یہی اختیاری نیکی یا بدی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے بنانے یا بگاڑنے میں اصل دخل رکھتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نیکی کی راہ میں ترقی کی

توفیق ملتی ہے۔ اور اگر وہ خواہشات نفس کے پیچھے لگ کے بدی کے راستہ پر چل پڑتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا دل برائی کا زنگ پکڑنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ یہ زنگ اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے اندر نیکی کی کوئی رمق باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کا مذاق طبیعت اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی ساری دلچسپی صرف بدی کے کاموں سے باقی رہ جاتی ہے، نیکی کے کام کرنا تو الگ رہا نیکی کی باتیں سننے سے بھی اس کو وحشت ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ آدمی کے دل پر یہ مہر اس کے گناہوں کی پاداش میں لگتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ (۱۰۰ - اعراف)

کیا ان لوگوں کو جو اگلوں کے بعد اس زمین کے وارث ہوئے اس بات سے کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے گناہوں کی پاداش میں ان پر بھی آفت لاتے اور ان کے دلوں پر مہر کر دیتے پس وہ سننے سمجھنے سے رہ جاتے۔

اس آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ دلوں پر مہر گناہوں کی سزا کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ۝ (۱۰۱ - ۱۰۲ اعراف)

اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنے کیونکہ یہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے۔ اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔ ہم نے ان میں سے اکثر کے اندر عہد کی پابندی نہیں پائی (بلکہ) ہم نے ان میں سے اکثر کو بدعہد اور نافرمان پایا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے احکام کی خلاف ورزی میں یہ پہلے سے مشاق تھے۔ اسی وجہ سے جب ان کے رسول بھی ان کے پاس اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں لے کر گئے تو انھوں نے

ان کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ جو لوگ حق کی تکذیب میں اس طرح دیدہ دلیر اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس سے ان کی عقل بالکل ہی ماری جاتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ وضاحت و تصریح کے ساتھ یہود کے بارہ میں فرمایا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۱۵۵ - نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر کے سبب سے مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

مذکورہ بالا آیات سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ماں کے پیٹ سے اس کے دل پر مہر کر کے نہیں بھیجتا بلکہ یہ مہر جس کے دل پر بھی لگتی ہے اس کے گناہوں کے قدرتی نتیجہ کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا گناہ وہ چیز نہیں ہے جس کے نتیجہ میں کسی کے دل پر مہر لگ جایا کرے، بلکہ کوئی فرد یا کوئی گروہ جب حق کو حق سمجھتے ہوئے، اپنے دل کی گواہی کے بالکل خلاف، محض ضد، نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس مخالفت پر جم جاتا ہے تب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ دل کا اس طرح مہر بند ہو جانا اور سمع و بصر کی صلاحیتوں سے اس طرح محروم ہو جانا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جو اس کی نعمتوں کی ناشکری کی پاداش میں کسی فرد یا گروہ پر اس دنیا میں نازل ہوتا ہے اور اسی عذاب کا فطری نتیجہ وہ عذاب عظیم ہے جس میں اس طرح کے لوگ اس زندگی کے بعد والی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے) وہ درحقیقت اسی ختم قلوب کے اسی قدرتی نتیجہ کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔

ختم قلوب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی یہی حقیقت احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے

ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک حدیث پر یہاں اکتفا کرتے ہیں۔

ان المومن اذا اذنب کانت نکتة سوداء فی قلبه فان تاب ونزع واستعتب صقل قلبه وان زادت حتیٰ تعلو قلبه فذٰلك الران الذی قال الله تعالیٰ کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون (ابن کثیر بحوالہ ترمذی)

(مومن جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑجاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیتا ہے، اس گناہ سے باز آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہوجاتا ہے۔ اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے پورے دل پر چھاجاتی ہے تو یہی وہ رَین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون (ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھاگئی ہے۔)

سلف صالحین کے نزدیک بھی ختم قلوب کی یہی حقیقت ہے۔ ابن کثیر نے اعمش کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجاہد نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا کہ سلف (صحابہؓ) دل کو اس ہتھیلی کے مانند سمجھتے تھے، جب آدمی کسی گناہ میں آلودہ ہوتا ہے تو (انھوں نے اپنی ایک انگلی سکیڑتے ہوئے سمجھایا) دل اس طرح سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو (دوسری انگلی کو سکیڑتے ہوئے بتایا) دل اس طرح بھینچ جاتا ہے۔ اسی طرح تیسری انگلی کو سکیڑا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تمام انگلیوں کو سکیڑ لیا۔ پھر فرمایا کہ جب دل گناہوں کے غلبہ سے اس طرح بھینچ جاتا ہے تو اس پر مہر کردی جاتی ہے۔ مجاہد نے بتایا کہ سلف (صحابہؓ) اسی چیز کو وہ رَین قرار دیتے تھے جس کا ذکر کلا بل ران علی قلوبهم الآیہ میں آیا ہے۔

ختم قلوب کی اصل حقیقت واضح ہوجانے کے بعد ہمیں جبر و اختیار کی اس بحث میں پڑنے کی ضرورت باقی نہیں رہی جو اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان برپا ہے اور جس میں یہ حضرات بے ضرورت اس آیت کو بھی گھسیٹ لے گئے ہیں۔ قرآن مجید نہ تو اس جبر کے حق میں ہے جس کے مدعی اشاعرہ ہیں اور نہ اس اختیار ہی کے حق میں ہے جس کے علم بردار معتزلہ ہیں بلکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم صرف چند اصولی باتیں یہاں بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں

کے لیے ان شاء اللہ کفایت کریں گی جو اس مسئلہ پر ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہوکر صرف علمی ذہن کے ساتھ غور کریں گے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں :—

(۱) مبدأ فطرت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ان میں سے جس کو بھی وہ اختیار کرنا چاہے اس کو اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی ہے۔ اس کے بعد اس کا نیک یا بد بننا اس کے اپنے رویہ اور توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق بخشتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے بدی کی راہ پر جانے کے لیے بھی چھوڑ دیتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ جن چیزوں پر انسان کا مواخذہ کرے گا یا جن پر اس کو اجر دے گا ان کے لیے اس نے انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی بھی بخشی ہے۔ جو لوگ اس اختیار و ارادہ کے حامل نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو مواخذہ سے بھی بری رکھا ہے۔ یہ اختیار و ارادہ انسان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے اور اس کا استعمال بھی انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کے تحت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے تحت انسان کے جس ارادہ کو چاہے پورا نہ ہونے دے البتہ اگر وہ اپنی کسی حکمت کے تحت اس کے کسی نیکی کے ارادہ کو پورا نہیں ہونے دیتا تو اس نیکی کے اجر سے اس کو محروم نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر اس کی کسی بدی کی اسکیم کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے اخروی خمیازہ سے بھی لازماً اس کو بری قرار دے دے۔

(۳) قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت کا بیان ہوا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی مشیت کو اس کے سوا کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی مشیت سرے سے کسی عدل و حکمت کی پابند ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل اور حکیم ہے، اس کا کوئی کام بھی عدل اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس وجہ سے جہاں کہیں بھی اس نے اپنی مشیت کو بیان فرمایا ہے اس کو اس قانون عدل و حکمت کے تحت سمجھنا چاہیے جس کے تحت اس نے اس دنیا کے نظم کو چلانا پسند فرمایا ہے۔ یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اپنی جو سنت اس نے خود جاری کی ہے اور جس قانون عدل کو اس نے خود پسند فرمایا ہے اپنی مشیت کے زور سے خود ہی اس کو توڑے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ

تبدیلی ہوگئی ہے تو وہ قانون بھی بدلا جا سکتا ہے جو سابق مصلحت کو سامنے رکھ کر بنا تھا۔

اسلام میں قانون سازی کا یہ دائرہ مختصر اور محدود نہیں ہے بلکہ نہایت وسیع ہے۔ یہی چیز ہے جس کے سبب سے اسلامی قانون کو حالات زمانہ کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی۔ اس زحمت کا احساس اگر ہو رہا ہے تو اس زمانہ سے ہو رہا ہے جب سے ہمارے مقلد فقہا نے اجتہادات کو ان کے دلایل کی روشنی میں جانچنے پرکھنے کا کام بالکل بند کر دیا۔ اور جو فتوے دستور اور مصلحت پر مبنی تھے ان کو بھی انھوں نے کتاب و سنت کے نصوص کی طرح اٹل اور ناقابل تغیر بنا کے رکھ دیا۔ ترکوں نے جو مجلہ احکام تیار کرایا تھا اس کے لیے جو ابتدائی اصول طے ہوئے تھے ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ فقہ حنفی کے جو مسایل رواج اور مصلحت پر مبنی ہیں وہ حالات اور مصالح کی تبدیلی کے لحاظ سے بدل دیئے جائیں۔

بقیہ سورہ بقرہ

اصل مقصد کے لیے استعمال نہ کرے جس کے لیے یہ فی الحقیقت عطا ہوئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو وبال بنا دیتا ہے۔ ان کے وبال ہونے کی صورت ان کے استعمال نہ کرنے کی حالت میں تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ رکھنے کے باوجود فکر و عمل کے ہر میدان میں عاجز و درماندہ رہتا ہے اور غلط استعمال کرنے کی صورت میں یہ وبال اس طرح بنتی ہیں کہ یہ آدمی کو زندگی بھر ہر وادی اور ہر صحرا میں سرزہ گردی کراتی ہیں یہاں تک کہ اس خلائے لامتناہی میں بھی اس کو چکر کراتی ہیں لیکن اگر نہیں پہنچنے دیتی ہیں تو اسی دروازے پر جو نجات اور فلاح کا اصلی دروازہ ہے۔

۱۱۔ آگے کا سلسلہ کلام

اب آگے انہی ایمان نہ لانے والوں کے ایک اور گروہ کا بیان ہو رہا ہے جس کی خصوصیات اور جس کا ذہنی پس منظر مذکورہ بالا گروہ سے کچھ مختلف ہے اس وجہ سے وہ مستقلاً ذکر کیے جانے کا مستحق ہے۔ فرمایا:-

(باقی آئندہ)

بقیہ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

باتوں کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

ایک یہ کہ ہم نے الائمۃ من قریش کا ایک ایسا محمل واضح کر دیا ہے جس کے واضح ہو جانے کے بعد یہ حدیث اسلام کے اصول مساوات سے کسی نوعیت سے بھی متصادم نہیں رہ جاتی۔ (باقی صد ۴۸ پر)

بحث و نظر

امین احسن اصلاحی

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

اور

اسلام کا اُصول مساوات

اس موضوع پر بحث شروع کرنے سے پہلے ہم یہ مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ اپنی دلچسپی کی نوعیت بھی مختصر طور پر واضح کر دیں۔

اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ اسلام میں خلافت کے لیے شرط ہے کہ خلیفہ قبیلہ قریش کا آدمی ہو، کوئی غیر قرشی خلافت کا جائز حقدار نہیں ہو سکتا اور اس بات پر وہ تمام امت کے اجماع کا دعویٰ بھی کرے تو گو اس کے اس دعوے کا سرچشمہ ہمارے نزدیک غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن ہم اس کی تردید میں اس وقت کوئی بحث چھیڑنا پسند نہیں کریں گے۔ بحث نہ چھیڑنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ غلط فہمی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کی اہمیت میں ہمیں کلام نہیں ہے اگر اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے اسلام کے اجتماعی و سیاسی نظام کے متعلق نہایت غلط تصور قائم ہوتا ہے۔ اس سے یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ جس طرح یہود کے ہاں بنی لاوی (حضرت ہارونؑ کی اولاد) کے سوا کوئی دوسرا امارت و سیادت کا حقدار نہیں ہو سکتا تھا یا جس طرح ہندو دھرم میں قیادت و امامت برہمن کا اجارہ ہے، ویش اور شودر کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ خدانخواستہ اسی طرح اسلام میں بھی قریش کے خاندان کو خلافت و حکومت کا اجارہ دار بنا دیا گیا ہے، کوئی غیر قرشی

اس چیز میں ان کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ اگر اس کو مان لیا جائے تو اس کی زد براہ راست قرآن مجید کے اصولوں پر پڑتی ہے۔ اس سے اسلام کا وہ اصول مساوات بالکل بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے جس کی تعلیم توحید و آخرت کی تعلیم کے بعد اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر دی گئی ہے۔

اس غلطی کی اس سنگینی کے باوجود اس وقت اس سے ہمارے تعرض نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آج سے بہت پہلے یہ مسئلہ تحریک خلافت کے دور میں زیر بحث آ کر بہت بڑی حد تک صاف ہو چکا ہے۔ اس زمانہ میں انگریز اہل سیاست اور انگریز مستشرقین نے اسی مسئلہ قرشیت کی آڑ لے کر یہ سوال اٹھایا تھا کہ جب اسلام میں منصب خلافت کے لیے قرشیت کی شرط ضروری ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بتایا جاتا ہے تو ہندوستان کے مسلمان ترکوں کی خلافت کی حمایت میں اس شد و مد کے ساتھ کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، آخر ترکوں کا قریش کے ساتھ کیا ناتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ اور تحریک خلافت کے دوسرے علماء اور لیڈروں کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے کہ انھوں نے بروقت اس غلط فہمی کی اصلاح کی اور حدیث الائمۃ من قریش کا ایک ایسا محمل واضح کر دیا جس سے نہ صرف انگریز مستشرقین کے اٹھائے ہوئے فتنے کا استیصال ہو گیا بلکہ اس غلط تصور سے جو دوسری بہت سی غلط فہمیاں موجودہ دور کے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتی تھیں ان کا بھی خاص حد تک سد باب ہو گیا۔

اگرچہ اس مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا کسی قدر مختلف ہے لیکن اس اختلاف کی نوعیت کسی اصولی اختلاف کی نہیں ہے بلکہ اسی مدعا تک پہنچنے کے لیے بعض دلائل کی بنا پر ہم نے ایک دوسرا راستہ (APPROACH) اختیار کیا ہے۔ یہ اختلاف نقطۂ نظر بھی ہمارے نزدیک ایسی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کی توضیح و تائید کے لیے ہم ایک خالص اکیڈیمک قسم کی بحث اس وقت ایک ایسے موضوع پر چھیڑیں جس سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری مسائل، زندگی سے براہ راست تعلق رکھنے والے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

اس وقت اس مسئلہ سے بحث کرنے پر ہم اس وجہ سے مجبور ہوئے ہیں کہ یہ ایک ایسی نوعیت سے ہمارے سامنے لایا گیا ہے جس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کو اسی شکل میں قبول کر لیں جس شکل میں یہ پیش کیا گیا ہے تو اس کی زد براہ راست اسلام کے مسلّم اصولوں پر پڑتی ہے، اس کی زد قرآن کے پیش کردہ حقائق پر پڑتی ہے، اس کی زد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر پڑتی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی زد اس ملک میں اسلام کے مستقبل پر پڑتی ہے۔

آئیے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ یہ مسئلہ کس نوعیت سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی اس دعوت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر اقامت دین کے لیے اٹھا ہے، وہ بہت سی باتیں پوری شد و مد کے ساتھ لوگوں کے سامنے دین و شریعت بتا کر پیش کرتا ہے۔ لیکن جب ان چیزوں پر عمل کا وقت آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کرنا جتنا آسان تھا ان پر عمل کرنا یا عمل کرانا اتنا آسان نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ عملاً بھی ان چیزوں کی خلاف ورزیاں کرتا ہے اور فکراً بھی ان کے خلاف اصول وضع کرتا ہے۔ جب خود اس کے اپنے ہی ساتھیوں کی طرف سے یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ یہ ہم اپنے ہی بیان کردہ اصولوں اور پیش کردہ نظریات کے بالکل خلاف جا رہے ہیں تو ان کو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ جس کو دنیا میں اسلام کو عملاً برپا کرنے کی جد و جہد کرنی ہے، اسلام کی خوبیوں پر صرف وعظ ہی کرنا نہیں ہے، وہ صرف نظریات کی دلکشی پر اپنے اصل مقصد کو قربان نہیں کر سکتا بلکہ اسے حکمت عمل کی روشنی میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا چیز لینی ہے اور کیا چیز ترک کرنی ہے۔ اپنے اس خیال کی دلیل وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے یہ پیش کرتا ہے کہ مساوات اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اس کا وعظ فرمایا لیکن چونکہ عملی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ خلافت اپنے بعد قریش ہی کو سونپیں اس وجہ سے حضورؐ نے مساوات کے اصول کو توڑ کر خلافت قریش ہی کے سپرد فرمائی۔ کہنے والے کی بات خود اس کے الفاظ میں یوں لوگوں کے سامنے آئی ہے:۔

"اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ حکمت عملی ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے کیونکہ وہ یا تو قافلہ میں شامل نہیں ہوتا یا پھر قافلہ کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنا پر قبول نہیں کر سکتا، اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے، جو قوت اس کے پاس

موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو جو مزاحمتیں راستہ میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں :

مذکورہ بالا عبارت میں "خیالِ حسن" کی پھبتی پر بھی نظر رہے اور اس "عملی نقطۂ نظر" کی کسوٹی پر بھی جو لکھنے والے کے نزدیک کسی بات کے ردّ و قبول کے فیصلے فرمایا کرتی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے :

"جو شخص چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا اور پھر دوران سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد (اقامت دین کے مقصد) کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب کے ساتھ حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستہ کی کن کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے، کن کن موانع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے، اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنی چاہیے"

اس فلسفہ کے بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے اس حکمت عملی کے استعمال اور اس کے تحت اسلام کے اصولوں میں لچک پیدا کرنے کی یہ مثال پیش کی جاتی ہے کہ دیکھو، مساوات اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اس کا وعظ فرمایا لیکن چونکہ حکمت عملی اور عملی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ خلافت اپنے بعد قریش ہی کے سپرد فرمائیں اس وجہ سے آپ نے مساوات کے اصول کو توڑ کر خلافت قریش ہی کے سپرد فرمائی۔

یہ اصول جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان پر بھی اچھی طرح غور کر لیجیے اور اس کے لیے جو مثال پیش کی گئی ہے اس پر بھی اچھی طرح غور کر لیجیے اور ساتھ ہی اس پس منظر پر بھی نگاہ رکھیے جو اس سارے فلسفہ کے پیچھے چھپا ہوا ہے کیا ان ساری چیزوں کے بعد کوئی شخص اس امر میں شبہ بھی کر سکتا ہے کہ دین کے اصولوں میں لچک پیدا کرنے اور راہ کے موانع میں سے بعض سے فائدہ اٹھانے اور بعض کے ترک کرنے کے معاملہ میں قائد کی حکمت عملی کے سوا کوئی اور رہنما اصول بھی ہے۔ جب بات اس حصر کے ساتھ کہی جائے گی جس حصر کے ساتھ یہاں کہی گئی ہے اور دلیل یہ دی جائے گی جو یہاں دی گئی ہے تو

اور خود کہنے والے کا عمل اسی اصول پر ہو گا جو بیان کیا گیا ہے تو آخر کوئی شخص اس کا مطلب اس سے مختلف کس طرح سمجھے گا جو الفاظ سے متبادر ہوتا ہے۔ دوسرے کے لیے تو کہنے والے کے قول اور عمل ہی کی شہادت اصل شہادت ہے۔

اس اصول کے نتائج | یہ اصول اس کی مذکورہ دلیل کے ساتھ ایک مرتبہ اگر مان لیا جاتا ہے تو آئیے دیکھیے کہ اس کے نتائج کیا کیا نکلتے ہیں۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ہماری طرف سے ان مستشرقین اور اسلام کے ان مخالفین کے اعتراض کی تائید ہو جاتی ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یوں تو زندگی بھر مساوات مساوات کا وعظ کرتے رہے لیکن جب آخر وقت آیا تو اپنی پیدا کردہ حکومت اپنے خاندان والوں کے سپرد کر کے چلے گئے۔

اس کی دوسری زد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر پڑتی ہے۔ ہم مسلمانوں کو اس بات پر فخر رہا ہے اور یہ فخر بالکل بجا ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دونوں دور — دورِ دعوت اور دورِ سیاست — بالکل ہم رنگ و ہم آہنگ ہیں۔ حضورؐ نے اپنے دعوت کے دور میں جن پاکیزہ اصولوں کی دعوت دی جب عملی سیاست کا دور آیا تو آپ نے انہی اصولوں پر ایک عملی نظام قائم کیا اور اس کو چلا کر دکھا دیا۔ اپنے کسی اصول میں بھی آپ کو سرمو ترمیم و تغیر کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ لیکن اگر مذکورہ بالا نظریہ مان لیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم خود اس بات کے معترف ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مساوات کا جو درس دنیا کو اپنی دعوت کے دور میں دیا جب سیاست کے دور میں عملاً اس کو قائم کرنے کا وقت آیا تو نعوذ باللہ حضورؐ اس میں بالکل ناکام ہو کے رہ گئے۔ درانحالیکہ اگر مساوات کی کوئی عملی قدر و قیمت تھی تو وہ اسی شکل میں نمایاں ہو سکتی تھی جب وہ صرف دلکش اقوال میں نہیں بلکہ زندگی کے عملی نظام میں ظاہر ہوتی۔

اس نظریہ سے ان لوگوں کو بھی اعتراض کی راہ ملتی ہے جو حدیثوں کی مخالفت کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر ہم حدیث الائمۃ من قریش کے متعلق کسی شخص کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اسلام کے اصول مساوات کے خلاف ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم خود یہ اقرار کرتے ہیں کہ یہ اور اس کی ہم معنی تمام حدیثیں قرآن کے خلاف ہیں۔ اگر فی الواقع یہ قرآن کے

خلاف ہیں تو قبل اس کے کہ کوئی صاحب ان سے حکمت عملی کے اصول کی دلیل نکالیں ان تمام حدیثوں پر منکرین حدیث کا حق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ ان کو قرآن کے خلاف قرار دے کر ان کا انکار کر دیں اور ان کا یہ انکار ایسی مضبوط بنیاد پر ہوگا کہ کسی صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہ ہوگا ۔

اس نظریہ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ہمارے پاکستانی مستشرقین کو اس ملک میں اقامت دین کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کے خلاف خود انہی کے ہاتھوں وہ حربہ ہاتھ آجائے گا جس کا توڑ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا ۔ پھر اسلام کی مخالفت کے لیے نہ انھیں حدیث کے انکار کی ضرورت پیش آئے گی ، اور نہ دور از کار تاویلات کی زحمت اٹھانی پڑے گی بلکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس ایک ہی دلیل سے آپ کی ان ساری دلیلوں کو بیکار کر کے رکھ دیں گے جو آپ اقامت دین کے حق میں پیش کریں گے ۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ یہاں اسلام کو عملی زندگی سے دور دور رکھنا چاہتے ہیں ان کی اصل دلچسپی آپ کے توحید و رسالت کے مسائل سے نہیں ہے بلکہ ان کی ساری دلچسپی انہی مسائل سے ہے جو ہماری تمدنی و اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے ہیں ۔ ان مسائل کے خلاف ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اب یہ باتیں وقت کے حالات و مصالح ، حکمت عملی کے تقاضوں اور عملی سیاست کے مطالبات کے خلاف ہیں ۔ ہمارے ملک میں جو رسائل و اخبارات اس اسکول کی ترجمانی کر رہے ہیں آپ ان کی تحریریں پڑھ کر آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت ان کی ساری قلمی کوششیں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہیں ۔ لیکن اب تک صورت حال کچھ ایسی ہے کہ انھیں اپنے مسلک کی تائید میں اسلام کے پورے ذخیرے میں سے کوئی ایسی چیز نہیں مل رہی ہے جو ان کے نقطہ خیال پر لوگوں کو مطمئن کر سکے ، اس وجہ سے قدم قدم پر انھیں بات بنانی پڑتی ہے اور جہاں بنتی نہیں ہے وہاں لنگڑی ٹیڑھی ہے لیکن اب اگر انھیں قیمتی دلیل ہاتھ آجاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حکمت عملی کے تقاضوں اور عملی سیاست کے مطالبات کو اس قدر اہمیت دی کہ ان کی خاطر اسلامی نظام کی وہ بنیاد ہی بدل دی جس پر قرآن مجید نے اس کو قائم کرنا چاہا تھا تو سمجھیے کہ ان کو مانگی مراد مل گئی ۔ اب بحث یہ نہیں رہی کہ سود کے متعلق ، جوئے اور شراب کے متعلق ، بے پردگی اور بے حیائی کے متعلق ، سینما اور رقص و سرود کے متعلق ، مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کے متعلق ، اسلامی حدود و تعزیرات کے متعلق اور اسلامی اساس قومیت کے متعلق قرآن و حدیث کے احکام و قوانین کیا ہیں بلکہ ان میں سے ہر چیز کی بابت اصل فیصلہ کن سوال یہ رہا کہ یہ چیز حکمت عملی کے تقاضوں

مطابق بھی ہے یا نہیں ؟

اسلام اور اسلامی نظام کے خلاف حریفوں کے ہاتھوں میں یہ ہتھیار پکڑا دینے کے بعد آپ خود سوچیے کہ اسلام کی کسی بات کے بھی قائم کرنے کے لیے آپ کے پاس کوئی دلیل باقی رہ جاتی ہے ؟ فرض کیجیے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرتی نظام کو بے پردگی کی برائی سے پاک ہونا چاہیے ، بے پردگی ہمارے مذہب میں حرام ہے ۔ مخالف جواب دیتا ہے کہ اصولی اور نظری پہلو سے تو یہ چیز بہت درست ہے لیکن عملی پہلو سے موجودہ زمانہ میں یہ بات مضر ہے اس وجہ سے اس کو گوارا کرنا پڑے گا ۔ آپ کہتے ہیں قرآن اور حدیث میں اس کی حرمت پر یہ یہ دلیلیں ہیں ۔ وہ جواب دیتا ہے کہ اسلام پر غور کرنے کے لیے خود آئیڈیلزم کی نگاہ کافی نہیں ہے اس کے ساتھ برابر کی دوسری آنکھ حکمت عملی کی بھی ہونی چاہیے اور وہی حکمت عملی والی آنکھ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز اختیار کرنی ہے اور کیا چیز قربان کرنی ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس طرح حکمت عملی کے تحت دین میں رد و بدل کی کوئی مثال پیش کرو ، وہ جواب دیتا ہے کہ حکمت عملی کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے مسلم اصول مساوات کو توڑ کر خلافت قریش کو دے دی اور محدثین و فقہاء نے اسی کے تقاضوں کے تحت غیبت جیسی ناپاک چیز کو ثواب بنا ڈالا ۔ بتائیے آپ کے پاس اس کے بعد کہنے کے لیے کیا بات باقی رہ جائے گی ؟

یہ خیال محض ایک معصومانہ خیال ہے کہ آپ ایک اصول بنائیں گے تو تنہا آپ ہی کا اس پر اجارہ رہے گا اور آپ اس کو بڑی احتیاط اور بڑی نیک نیتی کے ساتھ استعمال کریں گے ۔ اصولوں پر اس قسم کی اجارہ داری نہ آج تک کسی کی قائم رہی ہے ، نہ آئندہ قائم رہے گی اور نہ عقلاً اور عرفاً یہ جائز ہے کہ ان پر کسی کا اجارہ قائم رہے ۔ اصول ، متاع مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر دوست دشمن سب ہی کا حق ہوتا ہے ۔ اس وجہ سے بہر حال اس کو سب ہی استعمال کریں گے اور جب اس اصول کے تصنیف کرنے والے اس سے وہ کچھ نتائج نکال سکتے ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے تو اسی سے اندازہ کیجیے کہ وہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر مذہب کے خلاف کیا قیامت ڈھائیں گے جن کا شیوہ ہی مذہب اور اہل مذہب کی مخالفت ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ حکمت عملی کے اصول کے تحت جو شخص اسلام کے اصولوں میں کوئی رد و بدل کرے گا اسے اپنے اس اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کے طرز عمل سے کوئی

دلیل لانی پڑے گی تو یہ بات محض ایک مغالطہ اور فریب ہے۔ اس اصول کے تحت اسلام کے کسی حرام کو حلال کر دینے اور شریعت کے کسی اصول کو توڑ کر اس کی جگہ کوئی دوسری چیز بالکل اس کے ضد اختیار کر لینے کے حق میں دو نہایت ہی شاندار دلیلیں تو جیسا کہ عرض کیا گیا نقد نقد موجود ہیں —— ایک یہ کہ محدثین نے مصلحت و ضرورت کے پیش نظر غیبت جیسی حرام چیز کو ثواب بنا لیا اور دوسری یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اسلام کے مسلّم اصول مساوات کو توڑ کر اپنے بعد اپنی خلافت قریش کے سپرد کر دی —— ان دو دلیلوں کے موجود ہوتے ہوئے اب کسی تیسری دلیل کی ضرورت کہاں باقی رہی۔ انہی دلیلوں کو آپ ہی کی طرح دوسرا بھی پیش کرنے کا حق رکھتا ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ ان دلیلوں کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے کسی مزید دلیل کے لیے کیوں مطالبہ کرتے ہو؟

مذکورہ فتنوں کا سرچشمہ | یہ تمام فتنے اس لیے نہیں پیدا ہو رہے ہیں کہ خدانخواستہ خود اسلام کی تعلیمات میں کوئی ایسی چیز ہے جو ان کے لیے راہ کھول رہی ہے۔ اسلام اللہ کا آخری اور کامل دین ہے، اس میں اس قسم کے فتنوں کے لیے کوئی رخنہ موجود ہو تو کس طرح ممکن ہے؟ جو چیز ان فتنوں کی راہ کھولتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غلط مقصد حاصل کرنے کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح بات کی ایک کمزور تاویل اختیار کی جاتی ہے اور پھر اس کمزور تاویل کو بنیاد بنا کر اس پر ایک نہایت فتنہ انگیز اصول وضع کر دیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ فرمایا ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے تو آپ کے اس ارشاد کی مختلف تاویلیں ممکن ہیں اور لوگوں نے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، اس کی مختلف تاویلیں کی بھی ہیں لیکن ایک شخص یہ کرتا ہے کہ ان تاویلوں میں سے ایک تاویل وہ یہ اختیار کر لیتا ہے کہ حضورؐ نے قریش کو خلافت کے معاملہ میں دوسروں پر یہ ترجیح ان کی قرشیت کی بنا پر دی اور پھر اس پر غضب یہ کرتا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے اس حکم کے ذریعہ سے اسلام کے اصول مساوات کو توڑا۔ پھر غضب پر غضب اور ستم بالائے ستم یہ کرتا ہے کہ اپنے اس مفروضہ پر ایک نیا اصول وہ یہ وضع کر دیتا ہے کہ چونکہ حضورؐ نے حکمت عملی کے تحت اسلام کے ایک اصول کو توڑا اس وجہ سے کسی دوسرے کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت اسلام کے کسی اصول کو (توحید و رسالت کے سوا) توڑ سکے۔

اگر بات صرف یہیں تک رہتی کہ ایک شخص نے الائمۃ من قریش کا مطلب یہ لیا ہے کہ اسلام میں منصب خلافت کے لیے قریش کو ان کی قرشیت کی بنا پر دوسروں کے مقابل میں ترجیح حاصل ہے تو ہمارے نزدیک یہ محض تاویل کی ایک غلطی ہے اور ہمیں اس غلطی کی تصحیح سے، جیسا کہ اوپر بھی واضح کر چکے ہیں، اس وقت کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تاویل کی یہ غلطی پہلے بھی موجود رہی ہے لیکن اس سے وہ نتائج نکالنے کی جرأت آج تک کسی ایک مسلمان نے بھی نہیں کی جو نتائج اب اس سے نکالے گئے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط ناگزیر ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے کہ یہ اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف ہوا ہے ہمیں اجماعات کے پورے ذخیرہ میں کسی ایسے اجماع کا علم نہیں ہے جو اسلام کے اصولوں یا اس کے احکام میں سے کسی حکم کے خلاف ہوا ہو۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث آگے اپنے مقام پر آئے گی۔

ہمارا نقطہ نظر | اس مسئلہ کی مذکورہ بالا خرابیوں ہی کو محسوس کر کے اس کے بارے میں ہم نے اپنا نقطہ نظر ایک مضمون کی شکل میں پیش کیا تاکہ ان فتنوں کا سدباب ہو سکے جو اس کے اندر مضمر ہیں۔ ہم اپنے اس مضمون کے بعض ضروری نکات میثاق کے قارئین کی واقفیت کے لیے یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں۔ ہم نے اسلام میں مساوات کی حقیقت واضح کرتے ہوئے لکھا:-

"اسلام نے مساوات کی تعلیم ضرور دی ہے لیکن اس مساوات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد وہ تمام امتیازات بھی یک قلم ختم ہو گئے جو رشتہ رحم و قرابت یا قابلیت و صلاحیت یا اختلاف جنس یا اوصاف پر مبنی ہیں۔ اسلام میں مساوات بھی ہے اور ساتھ ہی اختلاف جنس کی بنا پر عورتوں اور مردوں میں جو فرق ہونا چاہیے اس نے اس کو بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے للرجال علیهن درجة اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح حاصل ہے۔ اسلام میں مساوات بھی ہے اور ساتھ ہی رحم اور قرابت کی بنا پر حقوق میں جو ترجیح و تقدیم ہونی چاہیے اسلام نے اس کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۔ ۷۵۔ انفال (اور جو لوگ آپس میں رشتہ رحم سے وابستہ ہیں وہ اوروں کے مقابل میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں) اسی طرح اسلام میں مساوات

چند پہلو انصار کے بھی بہت روشن تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان دونوں کی دینی خدمات کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے کچھ اسی طرح کے ہم وزن الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ دونوں مساوی الوزن معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دونوں کی دینی خدمات کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ کسی کا پلڑا بھی جھکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے اس پہلو سے ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی وجہ موجود نہ تھی۔"

ان سطروں کے بعد ہم نے قریش کو انصار پر ترجیح دینے کی یہ وجہ بیان کی تھی :۔

"لیکن دوسرے پہلو یعنی سیاسی زور و اثر کے لحاظ سے قریش کو انصار پر نمایاں فوقیت حاصل تھی۔ سیاسی زور و اثر تنہا تو اسلام میں کوئی وقعت رکھنے والی چیز نہیں ہے لیکن دین کے ساتھ مل کر یہ چیز ایک وجہ ترجیح بن جاتی ہے۔ امامت عامہ یعنی خلافت و امامت جس طرح دین کو چاہتی ہے اسی طرح سیاسی زور و اثر کو بھی یہ چاہتی ہے۔ قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی دینی پیشوائی اور سیاسی قیادت کا منصب حاصل رہا تھا اس وجہ سے اسلام لانے کے بعد یہ چیز اسلام میں بھی ان کو حاصل ہو گئی۔ اہل عرب کے لیے ان کی اطاعت کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں تھی بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز تھی۔ وہ جن کی اطاعت جاہلیت میں کرتے رہے تھے بڑی آسانی کے ساتھ، بغیر کسی کراہت کے ان کی اطاعت اسلام میں بھی کر سکتے تھے بشرطیکہ دین مانع نہ ہو۔ سو الحمد للہ اس قسم کا کوئی مانع باقی نہیں رہا تھا بلکہ قریش نے اسلام کی خدمت میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اس وجہ سے وہ دونوں چیزیں ان کے اندر جمع ہو گئی تھیں جو اسلام میں منصب خلافت و امارت کے لیے استحقاق پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے الائمۃ من قریش فرما کر انصار کے مقابل میں قریش کے حق میں فیصلہ فرمایا۔ اور اسی فیصلہ نے اس نزاع کے ختم کرنے میں بڑا کام دیا جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حضورؐ نے یہ فیصلہ قریش کے حق میں ان کی قرشیت کی بنا پر دیا۔ اگر اس وقت کوئی تیسری جماعت میدان میں موجود ہوتی اور وہ اپنی دینی خدمات اور سیاسی قوت و دبدبہ کے لحاظ سے مذکورہ دونوں جماعتوں پر فوقیت رکھنے والی ہوتی تو حضورؐ یہی فیصلہ اس کے حق میں بھی دے سکتے تھے۔"

جو شخص انصاف کے ساتھ مذکورہ بالا سطور کا مطالعہ کرے گا وہ انشاء اللہ مندرجہ ذیل (باقی صفحہ ۴۲ پر)

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

تین دن منیٰ میں!

منیٰ پہنچ کر ہمیں سب سے پہلے رمی جمرہ کرنا تھا، اس کے بعد قربانی کرنی تھی، پھر حجامت بنوا کر ہم احرام کی بڑی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ اچھی طرح تھا کہ مزدلفہ سے واپس آتے ہی یہ ساری خلقت رمی جمرہ کے لیے ٹوٹ پڑے گی اور اس بے پناہ ازدحام میں میرے جیسے شخص کے لیے بالخصوص زنانہ کے ساتھ مقام رمی تک پہنچ سکنا ناممکن ہو گا۔ چنانچہ میں نے خیال کیا کہ میں اولیت و افضلیت کا ثواب حاصل کرنے کے بجائے رخصت سے فائدہ اٹھاؤں اور کسی ایسے وقت میں رمی جمرہ کے لیے جاؤں جب ذرا آسانی کی توقع ہو۔ میں اپنی مجبوریوں کے پیش نظر اپنے ذہن میں یہی خیال لیے ہوئے تھا لیکن میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ افضلیت و عزیمت کا ثواب حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کی اس سرگرمی نے کچھ حرارت میرے اندر بھی پیدا کر دی اور ہم میاں بیوی بھی انہی کے ساتھ اللہ کا نام لے کر اس جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہم کچھ ہی دور آگے بڑھے ہوں گے کہ مجھے یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا کہ کم از کم میرے اور میری اہلیہ کے لیے تو مقام رمی تک پہنچنا ناممکن ہے۔ لیکن ایک نیک کام کا ارادہ کر لینے کے بعد اس سے پلٹنا ایک قسم کی کمزوری معلوم ہوا اس وجہ سے پیچھے مڑنے کے بجائے جتنے قدم آگے بڑھنا ممکن ہوا میں آگے ہی بڑھتا گیا۔ اگرچہ صورت حال سے طبیعت پر ایک سخت دہشت سی طاری تھی لیکن یہ امید ایک سہارا بنی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گا۔ اس موقع پر مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہجرت والا واقعہ بار بار یاد آتا رہا۔ بالآخر میں ایک ایسے نقطہ پر

پہنچ گیا جہاں سے نہ میرے لیے آگے بڑھنا ممکن رہ گیا اور نہ پیچھے ہٹنا۔ میرے رفقا اگرچہ اس اعتبار سے آزاد تھے کہ ان میں سے ہر ایک پر بس اپنے ہی نفس کی ذمہ داری تھی، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی زنانہ نہیں تھا، لیکن صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری تھی۔ وہ دل سے چاہتے رہے ہوں گے کہ میری کچھ مدد کریں لیکن چاہنے کے باوجود وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت میرا دل بالکل خدا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رمی کے میدان اور سڑک کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ اس دیوار نے مجھ کو اور میری اہلیہ کو بڑا سہارا دیا۔ ہم اس دیوار کا سہارا لے کر حیران و ششدر کھڑے ہو گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ ہجوم کا کوئی ریلا ہمیں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ لے جا پھینکے۔ ہم دونوں اس پریشانی کے عالم میں کوئی مفر تلاش ہی کر رہے تھے کہ ایک زبردست موج آئی اور اس نے ہمیں اٹھا کر اس جمرہ کے قریب پھینک دیا جس پر ہمیں کنکریاں مارنی تھیں۔ پاس ہی ڈیوٹی کے سپاہی کی راوٹی تھی جس کو ہجوم کے ریلے نے اکھاڑ کے پھینک دیا تھا۔ پولیس والا سہما ہوا دیوار سے لگا کھڑا تھا اور دو تین مصری عورتیں اس کی پناہ میں تھیں۔ ہمیں بھی اس سے کچھ سہارا ملا۔ ہم جوں توں کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے اور پھر کسی نہ کسی طرح اس ہجوم سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ سکے جہاں پہنچ کر ہمیں یہ توقع ہوئی کہ اب ہم شاید زندہ و سلامت گھر تک پہنچ جائیں۔

مجھے اس طرح کی صورتِ حال سے زندگی میں کبھی سابقہ پیش نہیں آیا تھا اس وجہ سے میرے اعصاب پر اس کا بہت سخت اثر پڑا۔ قدرتی طور پر میری اہلیہ مجھ سے بھی زیادہ متاثر ہوئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پہلے دن کی رمی افضل وقت میں صرف مضبوط لوگ ہی کر سکتے ہیں جن لوگوں کے ساتھ عورتیں اور بچے ہوں انھیں اپنے آپ کو اس سخت امتحان میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

قربانی کے لیے رمی سے فارغ ہو کر اب ہمیں قربانی کے لیے جانا تھا۔ مجھے یہ قربانی اپنے ہاتھ سے انجام دینے کا بڑا شوق تھا اس وجہ سے اس شدید تکان اور اضمحلال کے باوجود، جو رمی کے مذکورہ جہاد نے مجھ پر طاری کر دی تھی میں قربان گاہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے باہر نکل کر کچھ ہی دور چلا ہوں گا کہ ایک خاتون نے اپنے کسی عزیز یا عزیزہ کے گم ہونے کی اطلاع دی اور اس معاملہ میں مدد اور رہنمائی کی طلبگار ہوئیں۔ حکیم صاحب پیچھے تھے، وہ آئے تو اس واقعہ کا ذکر میں نے ان سے کیا۔ وہ فوراً گم شدہ کی تلاش کی مہم پر روانہ ہو گئے اور میں ان کی واپسی کے انتظار میں ایک ٹرک کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ منیٰ کی دھوپ میں

مجھے یہ ٹرک کا سایہ بھی لبا غنیمت معلوم ہوا۔ حکیم صاحب نے گم شدہ کی تلاش میں بڑی دیر لگا دی اور مجھے ٹرک کے سایہ میں بیٹھے بیٹھے یہ اندازہ ہوا کہ رمی جمرہ کی جدوجہد میں میں نے جو دھکے کھائے ہیں ان کے اثر سے میں اب بخاری کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ دھوپ نہایت سخت تھی اور قربان گاہ وہاں سے بہت دور۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو مزید کسی مشقت میں ڈالا تو یہ چیز میری قوتِ برداشت سے باہر ہو جائے گی اور عجب نہیں کہ میں بیمار پڑ جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ قربانی کے معاملہ میں میری نیابت کریں اور مجھے قیام گاہ پر واپس جانے کی اجازت دیں۔ ان کو میری حالت پر ترس آ گیا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گئے۔

وہ گھر سے ۸ - ۹ بجے کے نکلے ہوئے کہیں سہ پہر میں اس فرض سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ واپس آتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا ہوا تم نہیں گئے ورنہ واقعی بیمار پڑ جاتے۔ پھر ان ساری جھنجھٹوں کی انھوں نے تفصیل سنائی جن سے انھیں گذرنا پڑا۔ میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تفصیلات تھیں جو انھوں نے قربان گاہ اور قربان کیے ہوئے جانوروں سے متعلق سنائیں۔ قربان گاہ کے مشاہدات ان لوگوں کے دلوں میں ایسے شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں جو قربانی کی روحانی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان شبہات کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ان انتظامی خرابیوں کو ہے جو اب تک اس خاص شعبہ میں نہایت بدنما شکل میں نمایاں ہیں۔ امت کی کثرت کے ساتھ ساتھ ضروری تھا کہ انتظامات میں وسعت اور ترقی ہوتی اور اس سلسلہ میں ممکن حد تک وقت کی سائنٹفک ترقیوں سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے سعودی حکومت کے اپنے ذرائع و وسائل بھی خدا کے فضل سے اب کم نہیں ہیں۔ اور اگر وہ کچھ کمی محسوس کرے تو دوسری مسلمان حکومتوں کو تعاون کی دعوت دے سکتی ہے۔ قربان گاہیں اتنی تعداد میں ہوں کہ منیٰ کے ہر حصہ میں مقیم حاجیوں کے لیے ان تک پہنچنا آسان ہو، صفائی کے اس سے بہتر انتظامات ہونے ضروری ہیں، کھالوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک بڑے پیمانہ کی مشینری قائم کی جا سکتی ہے اور سائنس کی ترقی کے اس دور میں غربا کے لیے گوشت محفوظ کرنے کی بھی بعض شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ میرے نزدیک ان چیزوں کا کاروباری نقطۂ نظر سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ قربانی کی عظیم روحانی قدر و قیمت کو پیشِ نظر رکھ کر محض دینی و اصلاحی نقطۂ نظر سے یہ کام ہونے چاہئیں اگرچہ کاروباری نقطۂ نظر سے ان کاموں کا کوئی خاص

فائدہ نہ بھی ہو۔

حجامت قربانی سے فارغ ہونے کے بعد ہم حجامت بنوانے کے لیے اٹھے۔ مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ کے پہلے دن حجامت کا کاروبار اس بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے کہ بلا مبالغہ جو شخص ہاتھ میں صحیح طور پر استرہ بھی نہ پکڑ سکتا ہو وہ بھی اگر کسیت لے کر سڑک کے کنارے کہیں بیٹھ جائے تو شام تک سینکڑوں ریال لے کر اٹھے۔ میں سید عقیل صاحب کے چوبارے میں بیٹھا ہوا حجامت کی بے شمار قسمیں دیکھتا اور ان کو گنتا رہا۔ اس دن سر کا منڈانا درویشی اور عبدیت کا ایک نشان ہے اس وجہ سے تزئین و آرائش کا تو اس میں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن یہ چیز میرے دل پر بڑی شاق گذرتی تھی کہ بہتوں کو میں نے دیکھا کہ حجام نے اپنی صوابدید سے جہاں جہاں سے چاہا ہے ان کے سر کے بال مونڈ دیئے ہیں اور جہاں چاہا ہے چھوڑ دیئے ہیں۔ مجھے حجامت بنانے والوں کی اس خود مختاری سے اختلاف تھا اس وجہ سے میں تردد میں پڑ گیا کہ مجھے اس صورت حال کے پیش نظر اب کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اپنے سابق فیصلہ کے مطابق حلق کرانا چاہیے یا تقصیر ہی پر قناعت کرنی چاہیے۔ حکیم صاحب نے میرے اس تردد کو دیکھا تو بولے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں سر کٹانے کا دم داعیہ لے کر اٹھے ہوں، انھیں سر منڈانے کے معاملہ میں اتنا متردد نہیں ہونا چاہیے۔ چلو میں تمہارے حسب منشا انتظام کر دوں گا۔ ان کی اس حوصلہ افزائی سے مجھے بڑا اطمینان ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ ہم احرام کی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی فارغ ہو گئے۔

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جب میں عصر کی نماز کے لیے مسجد گیا ہوں تو میرا دل غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ یہ خوشی مجھے مسجد میں ہر چہرے پر محسوس ہوتی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے یہ صرف ایک اہم فریضہ کی ادائگی کی خوشی تھی۔ بس دل اس خیال سے باغ باغ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ایک بہت بڑی آرزو پوری کرا دی۔

دعوتیں منیٰ کے دوران قیام میں مختلف سرکاری دعوتیں بھی ہوتی ہیں۔ بعض سفارت خانوں کی طرف سے مجھے بھی دعوت نامے موصول ہوئے مگر مجھے سید عقیل صاحب کے چوبارے میں بیٹھے بیٹھے منیٰ کے تمام مناظر کی سیر اتنی دلکش معلوم ہوتی تھی کہ اس کو قربان کر کے کہیں آنا جانا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا چنانچہ میں کسی دعوت میں بھی نہ جا سکا۔ حکیم صاحب غالباً بعض دعوتوں میں شریک ہوئے۔

سعید رمضان صاحب سے ملاقات منیٰ کے قیام کے پہلے ہی دن یا دوسرے دن، میں چوبارے میں بیٹھا ہوا ملنے جلنے والوں سے خوش گپ کر رہا تھا کہ ایک مصری یا شامی نوجوان آئے اور انھوں نے علیک سلیک کے

بعد پوچھا کہ "آپ سعید رمضان کو جانتے ہیں؟" میں نے جواب دیا کہ "جی ہاں، ان کو جانتا بھی ہوں اور ان سے محبت بھی کرتا ہوں" وہ بولے کہ انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ "اگر آپ فارغ ہوں تو وہ یہاں آ جائیں ورنہ وہ فندق تیسیر میں مقیم ہیں آپ جب فارغ ہوں وہاں آ جائیے۔" میں نے کہا کہ "آپ ان سے [illegible] بہت بہت سلام عرض کیجیے اور کہیے کہ وہ یہاں آنے کی زحمت نہ اٹھائیں میں ان سے شام تک انشاء اللہ خود ان کے ہوٹل میں ملوں گا۔"

شام کو میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو ساتھ لے کر سعید رمضان صاحب سے ملنے کے لیے فندق تیسیر پہنچا۔ یہ ہوٹل بالکل جمرہ وسطیٰ کے پاس ہے۔ میں ہوٹل میں داخل ہوا تو میں نے ہوٹل کے مینجر صاحب سے پوچھا کہ فلاں نمبر کا کمرہ ہوٹل کے اوپر کی منزل میں ہے یا نیچے کی منزل میں؟ وہ میرا یہ سوال سن کر کچھ مسکرائے اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ان کے مسکرانے اور میرے سوال کا جواب [illegible] نے پر کچھ حیرانی سی ہوئی۔ اتنے میں ایک صاحب ہوٹل کے اوپر والی منزل کے زینہ سے، جو میرے پیچھے تھا، اترے اور "استاذ امین" "استاذ امین" کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ سعید رمضان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے مجھے سعید رمضان صاحب سے کبھی ملاقات کی سعادت نہیں حاصل ہوئی تھی اس وجہ سے ان کی اس محبت اور اس بے تکلفی کا میرے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

مینجر صاحب نے وہیں اپنے کمرے ہی میں فوراً کرسیاں ڈلوا دیں اور ہم بیٹھ گئے۔ سعید رمضان صاحب بار بار میرے شانوں اور میری رانوں پر تھپکیاں دیتے اور خیریت پوچھتے۔ اگرچہ اس طرح محبت کا اظہار اہل عرب کے آداب میں داخل ہے لیکن سعید رمضان صاحب کے طرز عمل میں صرف آداب کا رکھ رکھاؤ ہی نہیں [illegible] بلکہ جذبات محبت کی غیر معمولی فراوانی بھی تھی جو ان کی ایک ایک ادا سے نمایاں ہو رہی تھی۔

بیٹھتے ہی سعید رمضان صاحب نے پوچھا کہ کوئی ٹھنڈی چیز پیو گے یا گرم۔ ہم نے کہا پہلے بعد دیگرے دونوں۔ وہ ہماری اس بے تکلفی سے بہت خوش ہوئے اور ہماری خواہش پر انھوں نے پہلے ٹھنڈا پانی منگوایا اور پھر عمدہ قسم کی چائے۔ انھوں نے بغیر کسی تمہید کے مجھ سے کہا کہ جماعت اسلامی کے ساتھ تمہارے جو اختلافات ہیں ان کی خاص خاص بنیادی باتیں مجھے بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یہ داستان بڑی طویل ہے، اس کے سننے کے لیے نہ آپ کے پاس وقت ہے اور نہ میں اس کے بیان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے کہا میں صرف چند اصولی باتیں جاننا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہ باتیں عمر بہاء امیری صاحب[1] سے

[1] موصوف ایک زمانہ میں پاکستان میں [illegible] سفیر رہ چکے ہیں۔

معلوم کر سکتے تھے ، وہ ساری تفصیل سے واقف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ افسوس ہے کہ لاہور میں منعقد ہونے والی کلوکیم سے ان کی واپسی کے بعد سے میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر وہ اس اختلاف کے اسلامی تحریکات پر اثرات کو بیان کرنے لگے اور کہا کہ جس طرح بھی ہو ان اختلافات کو دور ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس خواہش میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں ، اسی طرح کی خواہش کا اظہار مجھ سے امیری صاحب نے بھی کیا تھا اور انہی کے اصرار پر میں نے ان کو حکم بھی مان لیا تھا۔ اب آپ ان سے معلوم کیجیے کہ وہ کوئی فیصلہ کیوں نہ کر سکے ؟ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں اس معاملہ میں دخل دوں تو کیسا رہے گا ؟ میں نے کہا کہ آپ اس معاملہ میں دخل دینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخص ہو سکتے تھے لیکن اب میری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ اس چیز کا وقت گذر چکا ہے ۔ اب اگر آپ نے دخل دیا تو اس کا نتیجہ اس سے شاید کچھ بہتر نہ نکل سکے جو امیری صاحب کی کوششوں کا نکل چکا ہے ۔

میرے اس جواب کے بعد انھوں نے بار بار بڑے گہرے تاثر کے ساتھ یہ فرمایا کہ، یہ بات بڑے غم کی ہے ۔ یہ بہت بڑا حادثہ ہے ۔

ہماری اس گفتگو کے دوران ہی میں یکے بعد دیگرے ان کے بہت سے ملنے والے آتے اور بیٹھتے رہے ۔ وہ دو دو باتیں ان سے بھی کر لیتے اور پھر میرے شانے تھپکتے ہوئے دو دو باتیں مجھ سے بھی کر لیتے ۔ میں نے اتنی ہی دیر میں یہ محسوس کیا کہ مختلف امصار و دیار کے لوگوں میں ان کو بڑی محبوبیت و مرجعیت حاصل ہے لیکن اس محبوبیت و مرجعیت کے با وجود ان میں قائدانہ ترفع اور زعیمانہ تمکنت کی قسم کی کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ وہ ہر ایک سے بڑی خاکساری ، بڑی تواضع اور بڑی محبت سے ملتے ہیں۔ ان کے چہرے سے سادگی اور ذہانت دونوں کے آثار بیک وقت ہویدا ہیں۔ پیشانی اخلاص کی گواہی دیتی ہے اور آنکھیں دل کی صفائی کی ۔ ان کی کوئی حرکت بھی مجھے مصنوعی نہیں معلوم ہوتی ۔

جب ان کو دوسرے ملنے والوں نے گھیر لیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کل مکہ واپس جا رہا ہوں۔ وہاں فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا ۔ اب وہاں ہم ملیں گے اور انشاء اللہ تفصیل سے باتیں کریں گے۔ اس کے بعد ہم سعید رمضان صاحب کے خلوص کا قلب پر بڑا گہرا اثر لیے ہوئے ان سے رخصت ہوئے ۔

جمرات اور ان کے راستوں کی تحقیق ہم ہوٹل سے نکلے تو چونکہ ایک جمرہ بالکل ہوٹل کے سامنے ہی ہے اس وجہ سے خیال ہوا کہ ان کے راستوں کی اچھی طرح تحقیق کرتے چلیں تاکہ دوبارہ آنے میں آسانی ہو۔ یہ

خواہش خاص طور پر اس وجہ سے ہوئی کہ پہلی رمی کے موقع پر ہم پر جو کچھ گذری تھی اس میں بہت کچھ دخل راستہ کی غلطی کو بھی تھا۔ میں اب اس قسم کے کسی ابتلا سے اہلیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ پھر ان کی یہ آرزو بھی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ ان کو اطمینان سے رمی کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے جب راستوں کی تحقیق کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ حکومت نے آنے اور جانے کے لیے دو بالکل الگ الگ راستے بنا دیے ہیں اور یہ دونوں راستے اتنے چوڑے ہیں کہ اگر لوگ ضبط و نظم کا لحاظ رکھیں تو ناقابل برداشت زحمت شاید کسی کو بھی پیش نہ آئے۔ لیکن ساری آفت یہ ہے کہ لوگ نظم و ضبط کے بالکل دشمن بن جاتے ہیں۔ میں نے جب راستوں کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو اہلیہ کو ایسے موزوں وقت میں لے جاتا کہ ذرا بھی زحمت نہ ہوتی۔

جمرات کے پاس کنکریوں کے جمع ہونے کے لیے جو ہودیاں بنی ہوئی ہیں میں نے دیکھا کہ ان میں بے شمار بڑے بڑے پتھر، جوتے اور ٹین کے ڈبے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ بعض پرجوش حاجی غصہ میں یہی چیزیں شیطان پر کھینچ مارتے ہیں۔ میں نے جب یہ چیزیں دیکھیں تو میں نے کہا اللہ اکبر، شیطان کے ہتھکنڈوں کی بھی کوئی حد نہیں ہے، اس نے مار کھاتے کھاتے بھی لوگوں کو طریق سنت سے منحرف کرنے کا ایک راستہ نکال ہی لیا۔

طواف اور سعی اب حج کے سلسلہ کا صرف ایک کام ہمارے ذمہ باقی رہ گیا تھا یعنی آخری طواف اور سعی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں مکہ واپس پہنچ کر یہ سنت ادا کروں گا۔ مجھے زنانہ کے ساتھ مکہ معظمہ جانا اور پھر منیٰ واپس آنا موجب زحمت معلوم ہوا۔ لیکن حکیم صاحب نے مجھے بتایا کہ بکثرت موٹریں اور بسیں مکہ معظمہ آ جا رہی ہیں، بڑی آسانی کے ساتھ ہم طواف اور سعی سے فارغ ہو کر واپس آ سکتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ تجویز پسند آئی اور ہم ایک ٹیکسی لے کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حجاج چونکہ ابھی تک منیٰ میں تھے، اس وجہ سے مطاف اور مسعیٰ میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ہم بڑے اطمینان کے ساتھ طواف اور سعی سے فارغ ہوئے اور فارغ ہونے کے بعد ایک دوسری ٹیکسی کر کے منیٰ پہنچ گئے۔ بعد میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم نے یہ کام بڑی دانشمندی کا کیا۔ اگر ہم یہ کام منیٰ سے واپسی کے بعد کے لیے اٹھا رکھتے تو بڑی مشکل میں پھنس جاتے۔ جب حجاج منیٰ سے واپس آ جاتے ہیں تو کئی دنوں تک ہم جیسوں کے لیے طواف یا سعی کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے اور عورتوں کے لیے تو سمجھیے کہ ممکن ہی نہیں رہ جاتا۔

آخری رمی اور مکہ کو واپسی تیسرے دن رمی کر کے ہمیں مکہ معظمہ واپس ہونا تھا۔ میں نے اور میری اہلیہ نے

سویرے ایسے وقت میں رمی کرلی جب ہم جیسوں کے لیے رمی کرنا ممکن تھا۔ لیکن ہمارے رفقاء افضل وقت کے منتظر رہے۔ قدرتی طور پر اس دن کا ہجوم کچھ پہلے دن کے ہجوم سے بھی زیادہ تھا۔ بالخصوص زوال کا وقت ہوتے ہوتے تو کچھ ایسی شکل پیدا ہوگئی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو اس ہجوم کے اندر جائیگا وہ واپس کس طرح آئے گا۔ ہمارے رفقا اس سمندر کے اندر غائب ہو گئے اور روانگی کا مقررہ وقت گذر چلا لیکن ان میں سے کوئی صاحب بھی نمودار نہیں ہوئے۔ میں نے یہ سارا وقفہ عقیل صاحب کے چوبارے سے ان دوستوں کی راہ دیکھنے میں گذارا اور ان کی بخیریت واپسی کے لیے دعائیں مانگتا رہا۔ بڑی انتظار کے بعد ان میں سے دو صاحبان نمودار ہوئے تو اس حال میں کہ قمیصیں تار تار اور کسی کی ٹوپی غائب کسی کا جوتا۔ میں ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لایا کہ یہ لوگ زندہ واپس آ گئے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ بے چینی کے ساتھ انتظار حکیم صاحب کے لیے تھا اور ان کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میں نے ان کے لیے بہت دعائیں کیں۔ میں جب ان کی طرف سے کچھ مایوس سا ہونے لگا اور میری پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکل دکھائی۔ اگرچہ اس وقت ان کا جو حلیہ بنا ہوا تھا اس کی تصویر کشی میرے قلم کے دایرہ امکان سے باہر ہے لیکن ان کی شکل دیکھ کر اس وقت مجھے جو خوشی ہوئی وہ خوشی شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

حکیم صاحب کے آنے کے بعد ہماری بس مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو گئی اور ہم شام سے پہلے پہلے اپنے مکان پر پہنچ گئے۔ ان تمام مراحل میں ہمارے معلم صاحب اور خصوصیت کے ساتھ ان کے دونوں نوجوان صاحبزادوں نے جس طرح اپنے حاجیوں کی قدم قدم پر رہنمائی کی اس سے میرا دل بہت متاثر ہوا۔ اور میں نے اس کے لیے دلی خلوص کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو جزائے خیر دے

بقیہ خلافت کے لیے شرط | دوسری یہ کہ اسلام کا نظام سیاسی جن اساسات پر قائم ہے ان میں سے ایک نہایت اہم اساس روشنی میں آتی ہے۔

تیسری یہ کہ منکرین حدیث یا مستشرقین کے لیے حدیث یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر کسی اعتراض یا نکتہ چینی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

چوتھی یہ کہ حکمت عملی یا عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت دین کو بازیچہ اطفال بنانے کی ہر راہ مسدود ہو جاتی ہے۔

لیکن ہمارے اس نقطہ نظر کے خلاف بعض اعتراضات اٹھائے گئے ہیں جو اگرچہ نہایت سرسری اور سطحی ہیں لیکن ہمارے لیے ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ اب ہم ان اعتراضات کو پیش کر کے ان کی حقیقت واضح کریں گے۔ (باقی آیندہ)

بقیہ "تذکرہ و تبصرہ"

اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بیماری اگر ہمارے اندر موجود ہے تو امریکہ اور روس والے تو ممکن ہے چاند پر پہنچ سکیں یا نہ پہنچ سکیں لیکن ہم تو تحت الثریٰ میں یقیناً پہنچ جائیں گے۔ اس قوم کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ اس بیماری کو سمجھے اور اس کو اپنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق دور کرنے کی کوشش کرے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے صدر ریاست کی نگاہ اس بیماری تک پہنچی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اپنی روایات اور اپنے مذہب کا انکار محض فیشن کے طور پر کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مرض کا ان کے نوٹس میں آجانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ازالہ کے لیے جو کچھ ارسکنا ان کے حیطہ اختیار میں ہے وہ کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ وہ اس قوم کی خودی کو بیدار کرنے اور اس کی مرعوبیت کو دور کرنے میں کامیاب ہوں۔

ہم نے اوپر عرض کیا ہے کہ اس ذہنی مرعوبیت کو دور کرنے کے لیے بیجا قسم کی فخاری اور حقائق سے چشم پوشی کوئی مفید چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمیں ان قوموں سے بہت کچھ سیکھنا ہے جو زندگی کی جد و جہد میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ اگر ہم اس ضرورت کا احساس نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ دوسروں کے حق میں نہیں بلکہ خود ہمارے ہی حق میں مضر نکلے گا لیکن جو کچھ سیکھنا ہے وہ ہوش و تمیز کے ساتھ سیکھنا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے لگ جانا یا ان کی ہر غلط اور صحیح چیز میں ان کی نقالی کرنا نہیں ہے۔ اگر وہ سائنس کی تحقیقات اور تجربات میں ہم سے آگے ہیں تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ وہ مذہب و شریعت، تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے اصولوں میں بھی ہم سے برتر ہیں۔ اگر ہم اس غلط فہمی میں پڑ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم ان سے جتنا حاصل کریں گے اس سے کئی گنا ان کے پیچھے لگ کر خود اپنا برباد کر دیں گے۔ اس وجہ سے وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ اس وقت اپنی قوم کی نئی نسل کو اس مرعوبیت سے بچانے اور اس کو صحیح راستہ پر لگانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ انشاء اللہ آیندہ صحبت میں ہم اس سوال پر غور کریں گے۔

اقتباسات و تراجم

ایک اہم اسکیم!

یورپ میں ایک اسلامی مرکز کی تاسیس

(از ڈاکٹر سعید رمضان)

اس وقت اسلام کے لیے کام کرنے والے جن مشکلات سے دوچار ہیں وہ مختلف قسم کی ہیں اور یہ مشکلات جتنی ہی بڑھتی جاتی ہیں اسی نسبت سے کام کرنے والوں کی ذمہ داریوں اور ان کے فرائض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ اب تک ہمارے مسائل کے لیے کوئی ایسی مشینری وجود میں نہ آسکی جو ہماری مشکلات میں سے ہر مشکل کا صحیح طور پر جائزہ لے کر اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسے ماہرین کھڑی کرسکتی جو پوری فرض شناسی کے ساتھ اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے اور پورے استقلال اور تسلسل کے ساتھ منظم طریقہ پر اس کے لیے اپنے ممکن وسائل استعمال کرتے۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تھوڑے سے جو کام کرنے والے میدان میں ہیں وہ افکار اور فرائض کا "کشکول" بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کس کس چیز کو سوچیں اور کس کس کام کو انجام دیں۔ ان کے حالات اتنی فرصت انھیں دیتے ہی نہیں کہ وہ اپنے کسی فکر کو بھی اچھی طرح پکا سکیں یا اپنے کسی فرض کو بھی صحیح طور پر انجام دے سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ہر کوشش خام اور ناقص رہ جاتی ہے، اور ان میں ایسے رخنے چھوٹ جاتے ہیں جن سے مخالفین فائدے اٹھا کر بالآخر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

جب تک اسلام کی خدمت کے لیے کوئی اس طرح کی واحد مشینری وجود میں نہیں آجاتی، جس پر سارے کاموں کے لیے اعتماد کیا جاسکے اس وقت تک ایک ہی عملی طریقہ نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ جو جو رخنے نظر آتے ہیں ان کو بند کرنے کے لیے وہ لوگ آمادہ کار ہوں جو ان کو محسوس کرتے ہیں اور جو ان کو بھر سکنے کی اپنے اندر صلاحیت پاتے ہیں۔ ان رخنوں کو بند کرنے کے لیے [illegible] خود بھی بہم پہنچائیں اور اس کام میں ان لوگوں کا بھی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں جو اس کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوں۔

اس مختصر یادداشت میں ہم جو اسکیم پیش کر رہے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑے رخنہ کے بند کرنے ہی سے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ہماری ان اسلامی سرگرمیوں سے ہے جن کا دائرہ اسلامی ممالک کے حدود سے باہر ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام خود اپنے ملکوں میں ایک سخت آزمائش کے دور سے گذر رہا ہے اور مسلمان اپنے مقامی مسائل ہی میں اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ان کی ساری طاقت انہی مسائل کے لیے کافی نہیں ہو رہی ہے، ہماری یہ اسکیم کچھ بے وقت کی راگنی معلوم ہوگی بلکہ بعض لوگ تو ممکن ہے اس کو اس اصل مقصد سے متصادم محسوس کریں جو اس وقت سب کے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ یعنی ایک ایسی خالص اسلامی نسل کی تربیت جو ایک باعزت مستقبل کے لیے بنیاد اور اساس بن سکے۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اسکیم، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا، عالم اسلامی کے موجودہ حالات کے تقاضوں سے متصادم نہیں ہے۔ بلکہ یہ انہی تقاضوں کا ایک جواب ہے اور اس سے وقت کی ضرورتوں میں سے ایک نہایت ہی اہم ضرورت پوری ہوتی ہے۔ ایک خالص اسلامی نسل کی تربیت کا جو نصب العین ہمارے سامنے ہے اس سے بھی اس کا کسی پہلو سے ٹکراؤ نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے اس تربیت اور اس تربیت کے لیے کام کرنے والوں کو بڑی قیمتی مدد ملے گی۔

تین اہم حقیقتیں

(۱) اسلام کے تمام خدمت گذار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلام کے خلاف اسلام کے دشمنوں کی سرگرمیاں اور سازشیں تاریخ کے ہر دور میں برابر جاری رہی ہیں۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی

بالکل واضح ہے کہ اس نئے دور میں ان سازشوں نے ترقی کرکے عالمی تحریکات کی شکل اختیار کرلی ہے جن کی نگرانی اور سرپرستی بڑے طاقتور، ظاہر و مخفی عالمی ادارے کر رہے ہیں۔ ہمارا اشارہ مشنری، صیہونی اور ماسونی تحریکات کی طرف ہے۔ عالم اسلامی کو پارہ پارہ کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور عالمی سیاست کو اپنے پیش نظر مقاصد کے محور پر گھمانے کے معاملہ میں مذکورہ بالا تحریکات کا پارٹ نہایت اہم رہا ہے جس کی اہمیت کو نظرانداز کرنا ہمارے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ جو لوگ ان سازشوں کے توڑنے کے لیے کوئی کام کرنا چاہتے ہیں ان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان کے مقاصد اور ان کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کے خطرات کا کماحقہ اندازہ کریں تاکہ اپنے پروگرام اور اپنے طریق ہائے کار میں ان چیزوں کو ملحوظ رکھ سکیں جن کا ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لیے جاسوس مقرر فرماتے تھے تاکہ مسلمانوں پر غفلت کی حالت میں کوئی حملہ نہ ہوجائے۔

(۲) اس وقت مسلمان قوم کے ہزاروں نوجوان ہیں جو یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پارہے ہیں۔ مزید براں مسلمان اقلیتیں بھی ہیں جو ان ممالک میں آباد ہیں۔ ان سب کے اندر چالاک اور بیدار صلیبیت اپنے پنجے گڑو رہی ہے اور فاسد سوسائٹی ان کے دین اور ان کی روایات پر غالب آرہی ہے۔ یہی نوجوان، جو ان ملکوں میں تعلیم پارہے ہیں، مختلف قسم کی سندیں اور ڈگریاں لے کر جب لوٹیں گے تو ہمارے ملکوں کے تمام اہم انتظامی اور رہنمائی دینے والے اداروں کے سربراہ ہوں گے۔

مسلم اقلیتوں کا ان ممالک میں یہ حال ہے کہ اب یہ آہستہ آہستہ اپنے مذہب سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔ ولایات متحدہ میں مسلمانوں کا جو حال ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈٹروئٹ کے مسلمانوں میں سے پانچ سو خاندان مسلمانوں سے بالکل بے تعلق ہوجانے کے سبب سے عیسائی ہوگئے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہماری کوئی ایسی تنظیم ہو جو ان نوجوانوں اور ان اقلیتوں کی برابر نگرانی کرتی رہے۔ اس معاملہ میں اب جو تاخیر بھی ہوگی وہ ایسے عظیم نقصانات کی موجب ہوگی جن کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگی۔

(۳) ہمارے تمام قومی اور وطنی معاملات میں جو سیاسی جھگڑے چل رہے ہیں ان کے پیچھے

درحقیقت وہ بدگمانیاں کام کررہی ہیں جو مغربی قوموں کو اسلام کے بارے میں ہیں۔ یہی بدگمانیاں ہیں جو پچھلی صلیبی معرکہ آرائیوں کو ایک نئی شکل و صورت میں ہمارے سامنے لارہی ہیں۔ جو لوگ اسلام اور اسلامی ممالک سے متعلق ان لوگوں کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور ان کے اخبارات اور ان کی نشریات پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس جھوٹ اور اس دروغ بافی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے جو ان کی کتابوں اور ان کے اخبارات میں پائی جاتی ہے اور چونکہ ان کی ان چیزوں کو کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہوتا اس وجہ سے ان لوگوں کی جرأت و جسارت بڑھتی جارہی ہے۔

اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس قسم کے فتنوں کا آخری علاج اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک صحیح قسم کی باا ثر اسلامی حکومت قائم نہ ہو۔ ایک ایسی اسلامی حکومت جو عملاً اسلام کی سچی تصویر ہو اور اپنے موثر اور طاقتور ذرائع سے ان تمام بہتانوں کی مدافعت کرسکے۔ تاہم اس وقت بھی ہمارے اوپر فرض ہے کہ اپنے محدود وسائل کے اندر ہم اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کریں جس سے ممکن حد تک مخالفین کی فتنہ پردازیوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اور اس مقصد کے لیے عالم اسلامی کے ایسے بہی خواہوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جو مغربی ممالک میں بھی رسوخ و اثر رکھنے والے ہوں۔

ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ ایک زمانہ میں تنہا امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ علیہ نے اس میدان میں نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ وہ جنیوا (سوئیٹزرلینڈ) میں ایک رصدگاہ بن کر بیٹھ گئے اور وہاں سے بیٹھے بیٹھے وہ ساری چیزیں حاصل کرتے جو اسلام کے خلاف یورپ کے ملکوں میں نکلتیں اور پھر ان کے جواب دیتے۔ مسلمانوں کے خلاف وہاں جو سازشیں ہوتیں ان کی ساری تفصیلات وہ جمع کرتے اور پھر ان سے اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو آگاہ کرتے رہتے۔ انھوں نے اپنی تنہا ہمت سے اس فتنے کے دروازے کو اپنی زندگی میں بند رکھا لیکن ان کی وفات کے بعد سے یہ چوپٹ کھلا ہوا پڑا ہے۔

ایک اسلامی مرکز کے قیام کی ضرورت

یہ تینوں باتیں واضح کرتی ہیں کہ اس وقت ہماری ایک نہایت ہی اہم ضرورت یہ ہے کہ یورپ کے